۷۶- ایضاً، جلد پنجم، ص ۴۴۴-۴۴۵

۷۷- گلزار ابرار، ص ۴۷۴

۷۸- نزھۃ الخواطر، جلد پنجم، ص ۴۴۵

۷۹- ایضاً، جلد پنجم، ص ۴۵۹-۴۶۲

۸۰- ایضاً، جلد چہارم، ص ۴۴۳-۴۴۴

۸۱- ایضاً، جلد پنجم، ص ۴۷۴

۸۲- ایضاً، جلد چہارم، ص ۳۱۲

۸۳- طبقاتِ اکبری، جلد دوم، ص ۴۸۴

مراجع وماآخذ

۱- آئینِ اکبری، ابوالفضل ترجمہ مولوی فدا علی طالب، لاہور

۲- اخبار الاخیار، عبدالحق محدث دہلوی، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۳۲ھ

۳- بزمِ تیموریہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، نفیس اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۹ء، طبع اوّل

۴- تاریخ ہندوستان، مولوی ذکاء اللہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،

۵- توزکِ جہانگیری، نورالدین محمد جہانگیر شاہ، نول کشور، لکھنو

۶- حدائق حنفیہ، مولوی فقیر محمد جہلمی ترجمہ خورشید احمد خان، مکتبہ حسن سہیل، لاہور

۷- دربارِ اکبری، مولانا محمد حسین آزاد، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء

۸- رودِ کوثر، شیخ محمد اکرام، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۹ء

۹- سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، غلام علی آزاد بلگرامی، علی گڑھ

۱۰- شعر العجم (جلد سوم) شبلی نعمانی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

۱۱- طبقاتِ اکبری (جلد دوم)، خواجہ نظام الدین احمد ترجمہ محمد ایوب قادری،
اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء

۱۲- طرب الاماثل بتراجم الأفاضل، عبدالحئ اللکھوی، قدیمی کتب خانہ، کراچی

۱۳- عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ، ڈاکٹر زبید احمد ترجمہ شاہد حسین رزاقی، لاہور

۱۴- کشف الظنون، مصطفےٰ بن عبداللہ القسطنطینی الرومی المعروف حاجی خلیفہ، المکتبۃ الصیقلۃ، مکہ المکرمہ

۱۵- گلزار ابرار، محمد غوثی شطاری مانڈوی ترجمہ فضل احمد جیوری، اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۳۹۵ھ

۱۶- مآثر الامراء، صمصام الدولہ شاہ نواز خان ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء

۱۷- مآثر الکرام، غلام علی آزاد بلگرامی، مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ، لاہور، ۱۹۷۱ء

۱۸- مسلمانوں کا نظام تعلیم، پروفیسر سعید احمد رفیق، اکیڈمی آف ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی

۱۹- معجم المفسرین، عادل نویھض، موسسۃ نویھض للثقافۃ، بیروت، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء

۲۰- مقالات شبلی (جلد سوم)، شبلی نعمانی، مکتبہ معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۳۲ء

۲۱- منتخب التواریخ، عبدالقادر بدایونی، تصحیح ولیم ناسولس، کلکتہ، ۱۸۶۸ء

۲۲- نزھۃ الخواطر، عبدالحئ حسنی، طیب اکیڈمی، ملتان، ۱۹۹۲ء

مشرق مغرب اور تہذیبوں کا مکالمہ

ڈاکٹر وحید عشرت
ڈپٹی ڈائریکٹر
اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور

ماضی پر نظر دوڑائیے تو آپ دیکھیں گے کہ مشرق اور مغرب دونوں فکری اور سیاسی دونوں سطحوں پر آپس میں متصادم چلے آرہے ہیں۔ مغرب نے اہل مشرق کو ان کے گرم موسموں کی وجہ سے سست، کاہل اور نکمے تصور کیا، کیونکہ شدید گرمی ان کے خیال میں انسانی، اعصاب کو شل کر دیتی ہے اور وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتے۔ اسی طرح ابن خلدون نے اہل مغرب کو اجڈ سمجھا اور کہا کہ سرد اور یخ بستہ ہوائیں انسانی عصبیہ کو سست اور غیر متحرک کر دیتی ہیں۔ سردی کی وجہ سے دماغ سن ہو کر رہ جاتا ہے وہ حرکت میں حتی کہ خوراک کے حصول میں بھی دقت محسوس کرتا ہے۔ راستے دشوار ہو جاتے ہیں پانی جم جاتا ہے اور گھر سے نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ لہذا اہل مغرب کی پسماندگی کا سبب شدید سردی اور دھند اور کہر میں لپٹا ہوا موسم ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے دانشوروں کے موسمی حالات کے حوالے سے دونوں تجزیئے کسی حد تک درست ہیں۔ سخت سردی اور سخت گرمی کے موسم دونوں انسانی اعصاب پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور وہی نتائج پیدا کرتے ہیں جو ان دانشوروں نے مرتب کئے مگر دونوں طرف کے ان عمرانی مفکرین نے موسموں کو تو دیکھا مگر انسانی عزم و استقلال کو نظر انداز کر دیا کہ اس کے سامنے موسموں کے اثرات لاکھ مہلک سہی مگر انسان نے اپنی ترقی اور فلاح میں ان کو سد راہ نہیں بننے دیا بلکہ کسی حد تک ان پر قابو پا کر مشرق اور مغرب میں عظیم تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ اب تو شدید موسمی اثرات بھی انسان کے کسی حد تک قابو میں آچکے ہیں اور دنیا انتہائی مختصر ہو کر انسانی مٹھی میں آ گئی ہے۔

سیاسی طور پر بھی ماضی میں مشرق و مغرب ایک دوسرے سے متحارب رہے ہیں۔ اہل بابل نے اور ایران کی عظیم حکومتوں نے عراق شام اور ترکی کو تاراج کر کے ایشیائے کوچک اور یورپ کے مشرقی حصوں تک نفوذ حاصل کر لیا۔ اور ہخامنشی ایرانیوں نے تو یونان کے صدر مقام ایتھنز کو سکندر اعظم سے بھی قبل جلا دیا تھا جس کا بدلہ لینے کیلئے ہی سکندر اعظم ایران پر حملہ آور ہوا اور اس نے تخت جمشید

کو جلادیا تھا۔ چنانچہ بابل، نینوا اور موصل کے علاقوں کے ریاضی دان، سائنسدان اور ماہرین نجوم وفلکیات علم کے ان مراکز سے بھاگ کر ایشیائے کوچک میں جمع ہوگئے اور وہاں سے یونان اور دیگر مشرقی یورپ کے علاقوں میں چلے گئے۔ ایشیائے کوچک کے شہر ملیٹس کا باشندہ طالیس ملطی یا اس کے آباؤ اجداد بھی ایرانی حملوں کے بعد ایشیائے کوچک میں پناہ لینے والوں میں شامل تھے جسے دنیا کا پہلا فلسفی اور سائنس دان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر ہی سہی مگر ہم یہاں عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یونان میں جو ایشیائے کوچک کے قریب ترین ہے وہاں فکری روئیدگی کا سبب بھی بابل و نینوا کے علاقوں سے بھاگے ہوئے دانشوروں کی سرگرمیاں تھیں انہی کے اثرات سے وہاں وہ تہذیب پیدا ہوئی جس نے یونان اور اٹلی میں بڑے دماغوں اور سیاسی نظاموں کو جنم دیا۔ جس میں فیثا غورث، سقراط، افلاطون اور ارسطو پیدا ہوئے اور جونہی وہ کھیپ ختم ہوئی تو یونان براعظم یورپ کے دوسرے ممالک کی طرح تاریکی میں ڈوب گیا۔

سکندر اعظم جو اس یونانی تہذیب کا سیاسی عروج تھا اس نے ایشیا کے ایک حصے کو اپنے پاؤں تلے روندا کر مغرب کو مشرق پر پہلی بڑی سیاسی برتری عطا کی اور مغرب اور مشرق کے درمیان تصادم کی ایک بڑی روایت کو جنم دیا۔ اس کے کچھ دیر جو فتح لیس سیزر قیصر روم نے شام، فلسطین، اردن اور مصر کو فتح کر کے اہل مشرق کی سائیکی میں مغرب سے تصادم اور اس پر غلبہ کی خواہش کو جنم دیا۔ یہی خواہش اہل مشرق میں خفتہ رہی اور جب اسلام نے قیصر و کسریٰ کے علاقوں پر غلبہ حاصل کیا اور وہ افریقہ کے شمالی علاقوں سے اور یورپ کے دروازے قسطنطنیہ پر فتح یاب ہوا تو اہل یورپ نے مزاحمت کیلئے یورپ کے حکمرانوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا تاکہ عالم اسلام کی سیاسی، مذہبی اور تہذیبی یلغار کو روکا جاسکے مگر سپین کے راڈرک کی پیش رفت ان کے کسی کام نہ آسکی اور اسلام کم و بیش ۹ سو سال تک اپنے پورے تہذیبی طمطراق کے ساتھ اندلس میں موجود رہا اس کے اثرات برطانیہ، فرانس، جرمن اور اٹلی اور صقلیہ تک مرتب ہوئے اور اسی طرح مشرقی یورپ میں بھی مسلمانوں کو فروغ ہوا۔

یورپ نے مسلمانوں کی کمزور سیاسی قیادتوں سے فائدہ اٹھا کر شیر دل وورچرڈ کی قیادت میں صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کیا جو واضح طور پر یورپ نے مذہبی اور مقدس لڑائی بنا دی اگرچہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے یورپ کو شکست دی اور ان کی پیش قدمی روک دی مگر اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ سپین اور یورپ سے مسلمانوں کا تقریباً خاتمہ ہوگیا۔ مسلمانوں کے سیاسی، فوجی اور تہذیبی زوال اور یورپ کی سائنسی ترقی اور علوم وفنون میں برتری نے مشرق و مغرب میں پھر آویزش کو جنم دیا اور مسلمانوں کے

علاقوں پر سائنس، ٹیکنالوجی اور فوجی برتری کی بنا پر یورپ نے قبضہ کرلیا اور عالم اسلام ان کی نو آبادیوں میں تبدیل ہو گیا۔ اگر یورپ نسل پرستی کے خبط میں اور عالم اسلام کو مد مقابل نہ پا کر ایک دوسرے کے مقبوضات کی چھینا جھپٹی میں مبتلا نہ ہوجاتا اور نٹشے کا اندھی قوتوں کا پروردہ سپرمین ہٹلر نمودار نہ ہوتا اور جرمنی اور اتحادیوں کے درمیان ٹکراؤ سے یورپ دو عظیم جنگوں سے تباہ نہ ہوتا تو یقیناً ابھی عالم اسلام کو آزادی نصیب نہ ہوتی اسلئے کہ جنگ سے افرادی قوت اور اقتصادی لحاظ سے برباد مغرب اب زیادہ دیر یورپی نو آبادیاتی نظام قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔

جرمنی کا فریڈرک اشپنگلر وہ پہلا بڑا مفکر ہے جس نے اس صورت حال کا اپنی مشہور کتاب "زوال مغرب" میں ادراک کیا کہ یورپ یعنی مغرب اب زوال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ٹوئن بی نے بھی تاریخی شعور کے تناظر میں اس زوال کو دیکھ کر مختلف مذاہب کے مثبت اور نمایاں پہلوؤں کے اشتراک سے ایک عالمی تہذیب، عالمی معاشرہ اور عالمی مذہب اور عالمی ریاست کے تصورات کی طرف پیش قدمی کی جو بطور ایک نصب العین کے امریکہ اور مغرب کے مختلف ذہنوں اور اداروں کے سامنے موجود ہے۔ اس کو جدید اور تیز رفتار سائنسی ترقی نے اور مؤثر کردیا ہے جس کے ذریعے دنیا سکڑ کر اور زمینی حد بندیوں سے اوپر اٹھ کر مختصر ہو گئی ہے۔ ٹوئن بی کے اس فلسفے کی امریکہ اور یورپ میں پذیرائی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی اور علوم وفنون بالخصوص اسلحہ، ذرائع ابلاغ، رسل ورسائل اور کمپیوٹر میں ترقی کی بنا پر اسے جو برتری حاصل ہوئی ہے ٹوئن بی کے تصورات امریکہ اور مغرب کے پوری دنیا پر غلبہ بلکہ قبضہ میں معاون بنے ہیں۔

یورپ یعنی مغرب کو عالمی سماج، عالمی مذہب، عالمی فلسفے اور عالمی ریاست کے قیام کے سلسلے میں تین اطراف سے مزاحمت کا خدشہ تھا۔ ایک عسکری اور اسلحی قوت روس تھا جو مغرب کی نسل پرستی سے بغاوت کر کے اقتصادی پیمانے پر سرمایہ دار اور پرولتاریہ میں سماج کی تقسیم کا قائل تھا اور وہ سرمایہ داری نظام کے برعکس اشتراکیت کے فلسفے پر ایک عدم طبقاتی سماج کی تخلیق چاہتا تھا۔ ایک متوازن اور مبنی برانصاف سماج جس میں انسان کی فوز وفلاح بنیادی مقصد ہو، مارکس کے پیش نظر ہوتا تو یقیناً اسے کامیابی ہوتی مگر اس کے عدم طبقاتی سماج میں ریاست بھی ایک آلہ استحصال تھی اور عدم طبقاتی سماج کے قیام کے بعد ریاست کو تاریخ کے عجائب گھر میں رکھے جانے کی ہمارکس نے اپنے یوٹوپیا میں نوید سنائی تھی۔ مگر عملاً جب اشتراکیت روس میں نافذ ہوئی تو اس کی ریاست عسکریت کا ایک عفریت بن کر ظاہر ہوئی جس نے ایک طرف تو مشرقی یورپ کو روند ڈالا اور دوسری طرف وسط ایشیائی مسلم ریاستوں کو

ہڑپ کرلیا اور جنوبی ایشیا کو پامال کرنے کیلئے جب افغانستان میں اکھاڑ پچھاڑ کی تو پاکستان نے اپنے افغان بھائیوں، عرب ممالک اور امریکی امداد اور اسلحہ سے اس کی تمام عسکری قوت کے باجود اٹھا کر دریائے آمو کے پار پھینک دیا۔ روس ریزہ ریزہ ہوگیا دیوار برلن گر گئی مشرقی اور مغربی جرمنی آپس میں مل گئے یورپی اتحادیوں کو کمزور کرکے ہٹلر نے جنوبی ایشیا کی آزادی کی راہ ہموار کرکے جو احسان کیا تھا وہ پاکستانیوں نے جرمنی کو اتحاد کا تحفہ دے کر اتار دیا اس روس کی بربادی کے نتیجے میں ہنگری آزاد ہوا جس کے دارالحکومت بوڈاپسٹ کی سڑکوں پر روسی ٹینکوں نے پچاس کی دہائی میں سینکڑوں نوجوانوں کو کچل دیا تھا۔ اور بوسنیا، کسووا، چیکو سلاویہ، یوگوسلاویہ آزاد ہوئے وہاں کی مسلم ریاستوں بوسنیا، کسووا، اور روسی ریاست چچنیا کو آزادی نصیب ہوئی اور اشتراکیت آج تاریخ کے عجائب گھر میں سجی اپنی بے چارگی آنسو بہا رہی ہے۔

دوسرا چیلنج مغرب کو چین سے ہوسکتا ہے مگر وہ بھی ایک اشترا کی ریاست تھا اور آبادی اور اسلحہ کے اعتبار سے مغرب کے ہم پلہ ہے، تاہم چین کے ثقافتی انقلاب کے بعد چین نے اشتراکیت کی کینچلی اتار کر پھینک دی ہے۔ اب وہاں مغربی ثقافت کا پھر سے چلن ہونے لگا ہے۔ اشتراکیت بھی بچی کھچی موجود ہے اور چین میں کنفیوشس ازم کا احیا بھی ہورہا ہے۔ سنکیانگ اور بعض دوسرے علاقوں میں روح مسلمان بھی بے قرار نظر آرہی ہے۔ چین نے گرچہ پاکستان کے توسط سے امریکہ سے دورہ ہنسری کسنجر کے بعد رابطہ کیا اور پاکستان کے توسط سے ہی وہ اسلامی دنیا سے بھی تلے تلے انداز میں روابط بڑھا رہا ہے تاہم چین دنیا کی ایک ارب آبادی کا وسیع سمندر ہے وہ اپنی حدود میں متلاطم رہتا ہے کناروں سے اچھل کر بے کراں ہونا اس کی روایت نہیں تاہم روس کے بعد امریکہ کو چین بھی ایک بڑا خطرہ محسوس ہورہا ہے بالخصوص چین کے عالم اسلام اور عالم اسلام کی ایٹمی قوت پاکستان سے بڑھتے ہوئے روابط ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ امریکی تجزیہ نگار اس بات سے خوف زدہ ہیں کہ اگر عالم اسلام اور چین اتحادی بن گئے اور جو کھیل امریکہ نے پاکستان کے ذریعے افغانستان میں کھیل کر روس کو انجام تک پہنچایا ہے وہی اگر چین نے مسلمانوں کے ذریعے امریکہ اور یورپ میں شروع کردیا تو مغرب تو دیکھتا ہی رہ جائے گا۔

تیسرا خطرہ مغرب کیلئے بھارت ہوسکتا تھا۔ آبادی زرخیزی اور رقبے کے لحاظ سے ایشیا کا ایک بڑا ملک ہے۔ امریکہ کی حکمت عملی مرتب کرنے والوں نے بھارت کی غلامی کی نفسیات سے پورا فائدہ اٹھایا اور اسے اپنا حلیف بنالیا۔ بھارت نے بھی اپنے مفعولی رویے کو اپنی ڈھال بنالیا اور مغرب اور امریکہ کو یقین دلادیا کہ وہ یعنی بھارت امریکہ اور اہل مغرب کا غلام ہے اور وہ چین کے مقابلے میں اگر طاقت اور

توانائی حاصل کرلے تو وہ چین کی توسیع پسندی بھی روک سکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر امریکہ کے مفادات کا خطے میں تحفظ بھی کرسکتا ہے۔ بھارت نے اس مقصد کیلئے ۱۹۶۲ء میں لداخ میں سرحدی چھیڑچھاڑ بھی کی مگر چین سے شکست جواہر لعل نہرو کی موت پر منتج ہوئی۔ بھارت نے اس شکست خوردگی کو مٹانے کیلئے ۶۵ء میں پاکستان پر حملہ کردیا اور یہاں بھی شکست ہی مقدر بنی جسے معاہدہ تاشقند نے دھوڈالا اور شکست خوردہ شاستری سیاسی فتح سے شادی مرگ کی نذر ہوگیا۔ بھارت کو نہ چین سے لڑنا ہے اور نہ لڑنا تھا وہ تو پرانے ہندو راجوں کی طرز پر ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں پر جھپٹنے کیلئے قوت حاصل کررہا تھا اور یہی اس نے بھوٹان، سکم، جوناگڑھ، حیدر آباد اور کشمیر میں کیا۔ اور یہی رویہ اس نے پاکستان، بنگلہ دیش سری لنکا، سیلون اور دوسرے ممالک سے اپنا رکھا ہے۔ مغرب اور امریکہ کو ہندو کی عیاری کا تجربہ نہیں، انہیں اپنی قوت پر بھروسہ ہے پھر ہندو بھی ایک ایسی تہذیب ہے جو ہندوستان سے باہر کہیں نہیں۔ اس کی توسیع پسندی سے مغرب اور امریکہ کو کوئی خدشہ نہیں اور ہندومت کبھی بھی عیسائیت اور مغرب کےلئے کبھی خطرہ نہیں رہا۔ تاہم اب بھارت میں گرجاگھر جلائے جارہے ہیں۔ اس کی مفعولیت مغرب کو ہمیشہ مرغوب رہی ہے۔ صرف ہندو کمزور کیلئے عفریت بنتا ہے۔ اسرائیل جو ایک یہودی ریاست ہے وہ اپنی تمام تر اقتصادی حیلہ گری کے پھر بھی عیسائیت اور مغرب کیلئے کبھی چیلنج نہیں بنا پھر دولت پرستی یہودی اور ہندو دونوں میں مشترک ہے۔ یہ وہ تمام صفات ہیں جن کی بنا پر امریکہ اور اس کی اتحادی قوتیں اسرائیل اور بھارت پر ریجھی ہوئی ہیں حالانکہ امریکہ اور اس کے اتحادی نہیں جانتے کہ بھارت عالمی سطح پر امریکہ اور مغرب کے کسی بڑے بحران میں کام نہیں آسکتا۔ بھارت میں پندرہ کروڑ سے زائد مسلمان چھ کروڑ، عیسائی بیس کروڑ، اچھوت اور سکھ اور دوسری اقوام آباد ہیں۔ ہندو پچاس کروڑ سے زائد نہیں۔ ایک کثیر النسل ملک جن میں کوئی چیز مشترک نہیں نہ نسل، نہ زبان اور نہ مذہب وہ قوت کے بل پر متحد ہے روس کی طرح ذرا سی چوٹ پڑنے پر یہ کسی بھی وقت بکھر سکتا ہے۔ اس کی بنیادیں بڑی کمزور ہیں۔ اس میں ایک عظیم قوت بننے کے امکانات مفقود ہیں اگر ایٹمی قوت روس کو تباہی سے نہیں بچاسکی تو بھارت کو کون بچائے گا ذرا امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو یہ تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائے گا۔ لہذا یہ مغرب اور امریکہ کیلئے کوئی حقیقی خطرہ نہیں۔ امریکہ کی یہ بھی بے وقوفی ہے کہ وہ دو ارب مسلمانوں کی قیمت پر پچاس کروڑ ہندوؤں سے محبت کی زیادہ پینگیں بڑھانے کو ترجیح دے رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے مغرب کیا کمائی کرتا ہے۔ امریکہ اور اہل مغرب کیلئے صرف اور صرف اسلام اور مسلمان خطرہ ہوسکتے ہیں۔ اسی لئے زوال

مغرب کی پیش گوئی کرتے ہوئے فریڈرک اشپنگلر نے مسلمانوں کو بھی خوف زدہ کرنے کی کوشش کی کہ جس طرح جسم نامی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتا اسی طرح ایک بار برباد ہونے والی تہذیب بھی دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ تہذیب بھی جسم نامی کیطرح ہے جو جنم لیتی، جوان ہوتی کہولت کا شکار ہوتی اور پھر مرجاتی ہے۔ اشپنگلر کے تہذیب وثقافت کو جسم نامی تصور کرنے کے پیچھے بھی ابن خلدون ہے جس نے انسانی عصبیہ پر یہ استخراجات کئے، ابن خلدون نے یہ ٹھوکر کیوں کھائی اس پر پھر کبھی بات ہوگی۔ تاہم تہذیب وثقافت کو جسم نامی تصور کرنا اشپنگلر کی بے تکی بات ہے اس کیلئے خود اس کے پاس دلائل نہیں اس نے تو ابن خلدون سے یہ نظریہ مستعار لیا ہے۔ یہ حماقت تو ہیگل کے ہاں بھی وارد ہوئی جس نے تاریخ کو نامی تصور کیا۔ بہر طور اقبال نے اشپنگلر کے اس نظریے کو اسلام کے حوالے سے قبول نہیں کہ اسلامی ثقافت بھی ایک جسم نامی ہے جس پر بچپن جوانی اور بڑھاپا وارد ہوسکتا ہے اس لئے کہ اسلام حیات بعد الموت پر یقین رکھتا ہے۔ اقبال اگر ابن خلدون کے موقف کو بھی رد کرتے کہ تاریخ، تہذیب اور ثقافت پر یہ نامیت کارگر نہیں تو صورت حال ہی بدل جاتی وہ بنیاد ہی گرجاتی جس پر بے چارہ اشپنگلر ایک ٹانگ پر کھڑا ناچ رہا ہے۔ اسلام صرف ایک تہذیب اور ثقافت نہیں تہذیب اور ثقافت اسلام کی پیداوار ہے اسلام ایک دین ہے اور دین آدم سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک اور اس کے بعد مسلمانوں میں ایک زندہ قوت کی طرح رواں دواں ہے۔ اقبال نے کیا خوب بات کی کہ مسلمانوں نے اسلام کو کبھی نہیں بچایا بلکہ اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں کو تحفظ، زندگی اور قوت بخشی ہے۔ اسلام کے بارے میں مغرب کے سارے شکوے اور اندازے غلط اور الٹکل پچو ہیں وہ مذہب کو یہودی نسلیت اور عیسائی پالی تثلیث کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، بیوقوف اشپنگلر کو اسلام پر مجوسیت کا جو غلاف نظر آتا ہے وہ اس کی اپنی عقل پر پڑا ہوا ہے۔ اسلام تو مجوسیت سے قبل بھی موجود تھا۔ اسلام پر مجوسیت عیسائیت اور یہودیت کے غلاف چڑھا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کو مسخ کیا گیا۔ چلئے اس قصے کو چھوڑیئے۔ یہ اپنے محل پر پھر کبھی بیان کروں گا۔ کیونکہ بحث بہت لمبی ہوجائے گی اور مجھے فرتھجوف شوآن (شیخ عیسیٰ نورالدین) مارٹن لینگلز (ابوبکر سراج الدین) اور اس پورے خانوادے کے دین اور مذہب کے انتشارات فکر تک آنا ہوگا جو وحدت دین کی بجائے وحدت ادیان کے شغل بے معنی میں گزشتہ پچاس سالوں سے جان کھپار ہے ہیں۔ اور تمام مذاہب اور تہذیبوں کو روایت کے ہمام دستے میں ڈال کر مسلسل کوٹ رہے ہیں کہ شاید کوئی ایسی معجون تیار ہوجائے جو وہ اکیسویں صدی میں بیسویں صدی کے دہشت زدہ انسان کو چٹا کر مغربی بالادستی کا نیا اکھاڑہ جما سکیں۔ ہمارے یہ

نومسلم بھائی اگر لارنس آف عریبا نہیں ہیں تو انہیں جان لینا چاہیے کہ چغے، عمامے اور محض ڈاڑھی میں اسلام نہیں ہے۔ انہیں دین میں صحیح طریقے سے پورے پورے داخل ہونا چاہیے اور مغربیت کے تمام بتوں کو اپنی آستینوں سے گرا کر رود بار انگلستان میں ڈبو دینا چاہیے۔

مغرب کے وہ جدید دانشور جن میں کئی نام شامل ہیں اور جو روس کی جدید ترین ایٹمی عسکریت کی ایٹمی اسلحے سے نہتے افغانوں اور پاکستانیوں کے ہاتھ پٹائی اور تباہی کا بیسویں صدی کے آخر میں نظارہ کر چکے ہیں۔ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے ان کی ٹانگیں کانپ رہیں ہیں۔ رچرڈ نکسن، ہنری کسنجر، برنارڈ لیوس، جان ایسپو، ہنٹنگٹن اور فرانسس فوکویاما کی تمام تر دانشوری اس شعبدے سے امید لگائے ہوئے ہے کہ وہ مسلمانوں کو ذہنی شکست خوردگی کے احساس میں جکڑ دے اور سائنس، ٹیکنالوجی، ذرائع ابلاغ، مواصلات اور کمپیوٹر سے مسلح امریکہ اور مغرب عالم اسلام پر پل پڑے، انہیں کچل ڈالے، اقتصادی طور پر اپاہج کرے اور ان کو الگ باندھ کر رکھے تاکہ یہ آپس میں مل کر مغرب کی عالمی بالادستی کا شیش محل اپنی کسی منجنیق سے پتھر پھینک کر چکنا چور نہ کر دے، اسی لئے وائٹ ہاؤس پر کوئی معمولی سا کنکر بھی پھینکتا ہے تو وہ دہشت گرد بن کر امریکہ کو مطلوب ہو جاتا ہے اور اگر امریکہ عراق، افغانستان اور لیبیا میں بم گرائے، غنڈہ گردی کرے تو وہ اسے اپنا استحقاق سمجھتا ہے اس لئے کہ ابھی وائٹ ہاؤس کی دیواروں میں دراڑیں ڈالنے والے پالنوں میں اونگ رہے ہیں۔ یہ کسی کے محتاج نہ ہوں گے یہ اپنی قیادت خود پیدا کریں گے اور موجودہ دور کی منافقت کے سارے لبادے جلا کر انقلاب کا پرچم اٹھا کر نکلیں گے۔

تاریخ کا عمل نہ تو ہیگل کی تصوری جدلیت کا تابع ہے اور نہ مارکس کی مادی جدلیت کا اور نہ ابن خلدون اشپنگلر اور ٹوئن بی کی نامیاتی اصطلاحات تاریخ کے عمل کو جکڑ سکتی ہیں۔ اور نہ تہذیبوں کا ٹکراؤ فرانسس فوکویاما کی رائے کے مطابق خیالات و نظریات کے تصادم سے ہوتا جس سے کہ تاریخ کی افزائش ہوتی ہے۔ فوکویاما نے اپنے اس نظریے میں کوئی نئی بات نہیں کی اس نے صرف ہیگل کی تصوری جدلیت کا ایک بھدا سا چربہ تیار کیا ہے اور ایسے ہی کمتر اور بودے تصورات پر مغرب نے صدیوں سے ایمان لا کر انسانیت کو تناؤ کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے اور مغرب بار بار مشرق سے لڑنے اور اس پر چڑھ دوڑنے اور اس کو فتح کرنے کے خبط میں مبتلا ہے۔ ابھی تک مغربی دانشور اس سفاکانہ جنگی بخار سے باہر نکلنے پر آمادہ ہی نہیں۔ وہ نئے حقائق کو دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہوئے ان کی سوئی ابھی تک مشرق کو پچھاڑنے پر اٹکی ہوئی ہے۔ حالانکہ اگر وہ آگ سے کھیلنا نہ چھوڑیں گے تو وہ اس گمان میں نہ رہیں کہ خود

جھلسنے سے بچ جائیں گے۔ انہیں اب نئے حقائق کا شعور حاصل کرنا چاہیے کہ نہ مغرب مشرق کا دشمن ہے اور نہ مشرق مغرب کا دشمن ۔ یہ اب کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔ مغرب کا پسماندہ اور بیمار ذہن اور صلیبی جنگوں سے خوف زدہ نفسیاتی طور پر مریض اوراعصاب شکستہ انسان ابھی تک فطرت کا یہ اشارہ نہیں سمجھتا کہ مشرق اور مغرب الگ الگ نہیں بقول قرآن دونوں اللہ کیلئے ہیں دونوں جگہ کا انسان ایک ہے ایک ایسے آدرش، ایک جیسی امنگیں ، ایک جیسی تمنائیں اور آرزوویں اپنے سینے میں آباد کئے ہوئے ہے۔ اسے مشرق ومغرب کے جنگجو اور جنگ کے طبل اور بتاشے بجانے والے غبی اور انسانیت دشمن دانشوروں جن کی مغرب میں اس وقت اکثریت ہے اور جو ذرائع ابلاغ اور پریس کے خنجروں سے لیس ہیں انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں جو ان میں افتراق ڈال کر انہیں آپس میں گتھم گتھا کرنے کیلئے منطقیں بگھارتے رہے ہیں ۔ انہیں اپنی ناک کی اونچائی سے انسان بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ دوسرے وہ سیاہ بخت مغربی سیاسین ہیں جو بندروں کی طرح اچھل کود رہے ہیں ان کے ہاتھ میں ایٹمی ٹیکنالوجی کا استرا آگیا ہے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ انسانیت کے گلے پر چلانہ دیں اس لئے کہ ایٹمی ماچس کی تیلی انسان کے ہاتھ میں ہے اور خرمن انسانیت کے مستقبل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ اگر انہیں انسانیت کے مستقبل سے کوئی دلچسپی ہو تو وہ اپنے لئے اور مکارم اخلاق اور دوسروں کیلئے دوسرے مکارم اخلاق وضع نہ کریں کفر پر حکومتیں قائم رہ سکتی ہیں ظلم پر نہیں تاہم امریکہ اور اہل مغرب کی ساری سیاست ظلم پر تناور ہو رہی ہے۔

عالم اسلام۔ عالم اسلام ، برنارڈلیوس کو ۲۱ویں صدی میں اس لئے مدمقابل نظر آتا ہے کہ عالم اسلام کی چندھیائی ہوئی آنکھوں کی میل کچیل خود مغرب اتار رہا ہے ۔ جس طرح یہ کہاوت ہے کہ مسلمانوں نے مار مار کر مہذب بنایا اسی طرح یہ بن کہاوت بننے والی ہے کہ امریکہ اور یورپ مسلمانوں کو مار مار کر اپنے خلاف متحد ہونے پر مجبور کردیں گے۔ روسی عسکریت کے ساتھ افغانوں اور پاکستانیوں کے ٹکراؤ اور روسی ریچھ کی الٹے پاؤں دوڑ سے مغرب میں یہ احساس ابھرا ہے کہ مسلمان ابھی زندہ ہے اور وقت نے اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔ ذراسی وقت نے راکھ اڑادی تو نور توحید سے دہکتا ہوں یہ سرخ انگارا اور تپش دینے لگے گا غفلت کی راکھ میں دبی ہوئی آگ کو ایمان کی پھونکنی کی معمولی سی ہوا نے اور روشن کردیا ہے جہاد کے خلاف مغرب نے ہمیشہ سازشیں کہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو غدر بتایا، اسباب بغاوت ہند کا رسالہ اور کاذب نبوت دونوں مسلمانوں کے اس جذبے کو سرد نہ کرسکیں۔ مسلمانوں میں مہدویت ، مجددیت امامت اور موعودیت کے نام پر مغرب نے جتنے بھی ذہنی غلام پیدا کئے وہ مسلمانوں

کے جذبہ جہاد کو سرد نہ کرسکے، بے تیغ مسلمان سپاہیوں نے لڑلڑا کر جہاد کے ذریعے ہر بار مغرب کی بساط الٹ پلٹ دی۔ اور وہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر حیرت بن کر رہ گیا ہے۔ ۲۱ صدی میں مغرب خوف زدہ ہے کہ یہ نہتے مسلمان خود اس سے ایٹمی ہتھیار اور ٹیکنالوجی چھین کر اس پر نہ پل پڑیں۔ اور وہ سحر بے حجاب ہوجائے جو اقبال کی مجذوبانہ فراست نے دیکھی تھی۔ ظلمت ، کفر اور ظلم کی شب مسلمان کے لہو سے گریزاں ہو جائے اور ۲۱ویں صدی میں دنیا ایک نئے خورشید کے جلووں سے ضیاء بار ہواور یہ جہاں توحید کے نعروں سے معمور ہوجائے۔

عالم اسلام اس وقت دنیا کی بہترین جغرافیائی حدود پر قابض ہے بلکہ اگر یہ کہاجائے کہ معلوم دنیا کے قلب میں واقع ہے تو بے جانہ ہوگا۔ مشرق اور مغرب دونوں کے راستے عالم اسلام سے گزرتے ہیں۔ عالم اسلام کی اسٹرٹیجک پوزیشن ، مشرق اور مغرب میں توازن قائم رکھنے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بھارت عالم اسلام کی اجازت اور مرضی کے بغیر یورپ سے روابط نہیں رکھ سکتا مسلمان اگر تھوک دیں تو اسرائیل اس میں ڈوب جائے اسرائیل عالم عرب کو ایٹم بموں سے ڈراسکتا ہے مگر استعمال نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ اس پر ایک ایٹم بم گرادیا جائے تو وہ نابود ہوجائے۔ اسی طرح امریکہ اسرائیل کو اسٹیبلش کرنے کیلئے فلسطینیوں کی اشک شوئی چاہتا ہے کیونکہ پرامن بقائے باہمی سے ہی اسرائیل قائم رہ سکتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ نازیوں کی طرح فلسطینیوں کے ہاتھوں یہودیوں کا دوبارہ قتل عام ہو کیونکہ اسرائیل کے بعد یہودیوں کو اور کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ عالم اسلام کے پاس بہترین افرادی قوت ہے۔ بہترین دماغ ہیں۔ بہترین محنت کرنے والے ہاتھ ہیں۔عالم اسلام کے پاس بہترین زمینی ، آبی اور فضائی راستے ہیں۔ پانی تیل، سونا، گیس، معدنیات اور سب سے بڑھ کرزرخیز زمینیں ہیں جو ضرورت کا اناج پھل اور پھول اگا سکتیں ہیں۔ مادی لحاظ سے عالم اسلام کو قدرت نے بڑی فیاضی سے نوازا ہے۔

عالم اسلام ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ متعدد عوارض میں بھی گھرا ہوا ہے۔ اس کے وسائل پر خود اس کی اپنی دسترس نہیں عالم اسلام پر مغرب کا پس نوآبادیاتی نظام مسلط ہے۔ یہاں جو بادشاہتیں ہیں ان کی زندگی اور بقا کا دارومدار بھی خود مغرب پر ہے۔ وہ مغرب کی آکسیجن کے بغیر سانس نہیں لے سکتیں۔ وہ اپنے عوام میں اپنی جڑیں نہیں رکھتیں۔ وہ مغرب کے آکسیجن ٹینٹ میں زندہ ہیں۔ جہاں عالم اسلام میں آمریتیں ہیں وہ نہایت درجہ کرپٹ ہیں۔ عالم اسلام کی رگ تاک بھی پنجہ یہود و نصاری میں ہے۔ اقوام متحدہ ، سلامتی کونسل ورلڈ بینک ، عالمی مالیاتی ادارے یہ تمام امریکی نجار کے رندے ہیں۔ عالم اسلام کی دولت تیل زرعی اجناس اور معدنیات ، امریکہ ، برطانیہ ، فرانس اور سوئٹزرلینڈ

کے بنکوں میں پڑی ہے اور عالم اسلام ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر پھوٹی کوڑی بھی استعمال نہیں کرسکتا۔ ہماری اپنی دولت بھی ہمیں بھیک میں ملتی ہے۔ ایف سولہ طیاروں کی رقم کی واپسی اس کا ثبوت ہے۔ امریکہ جب چاہتا ہے عراق پر چڑھ دوڑتا ہے اور عالم اسلام گونگا بہرا ہو کر بیچارگی سے یہ تماشا دیکھتا رہتا ہے۔ کہیں سے کسی درماندہ راہرو کی صدائے دردناک بھی احتجاج میں سنائی نہیں دیتی۔ عراق کے معصوم بچوں کی لاشیں اور عورتوں کی چیخیں بھی ہم دیکھنے اور سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ہمیں زندہ رہنے کیلئے بھی اذن امریکہ دیتا ہے۔ کیوں اس لئے کہ ہم امریکہ اور کفر کی طاقتوں سے خوف زدہ ہیں۔ جذبہ جہاد سے مسلمان عوام تو سرشار ہیں مگر مسلمان عوام پر مسلط قیادتیں بالکل بانجھ ہیں۔ ہماری جمہورتیں بھی ہماری بےچارگی کا نوحہ ہیں۔ عالم اسلام جس دلیر، جری، زیرک اور جذبہ ایمانی سے سرشار قیادت کا خواہاں ہے وہ ہمیں ابھی تک نظر نہیں آرہی۔

بہترین جغرافیائی محل وقوع، بہترین افرادی قوت، بہترین معدنی دولت اور آبی اور زمینی وسائل رکھنے والا عالم اسلام جس کے پاس جذبہ جہاد بھی ہے اور بہترین کتاب حکمت قرآن بھی اور اپنے عہد کے عصری مسائل کے حل کی کلید اجتہاد بھی اس کیلئے کونسی راہ عمل ہے جس کو اپنا کر وہ نوع انسانی کو وہ قیادت فراہم کرسکتا ہے جس کے ہاتھوں میں اس کے لئے امن، ترقی اور خوشحالی کی بشارت ہو۔ یہ ہے وہ سوال جس کا جواب مجھے فراہم کرنا ہے۔ مگر پہلے یہ تجزیہ کرلیں کہ مسلمانوں نے اس کیلئے اب تک کیا راہ عمل اختیار کررکھی ہے۔

خلافت راشدہ کے بعد جب اموی ملوکیت قائم ہوئی اور فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور اموی ملوکیت نے اپنے استحکام کیلئے خلفائے راشدین کا طریق چھوڑ کر نئے نئے سہارے تلاش کرنے شروع کردیئے اور عالم اسلام کو نت نئے مسائل سے سابقہ پڑا، تو ان حکمرانوں کی نظریں آہستہ آہستہ قرآن سے ہٹتی گئیں اور انہوں نے یہودی اور مسیحی علم کلام سے اپنے کاموں کے جواز فراہم کرنے شروع کردیئے تاکہ ان کے ظلم وتشدد، ملوکیت اور قرآن سے انحراف کیلئے دلائل میسر آسکیں۔ قرآن پر نہیں مسلمانوں نے خود پر پہلا ظلم قرآن سے انحراف کیا اور جبریہ، قدریہ، اشاعرہ اور معتزلہ اور تصوف کے مکاتب فکر وجود میں آئے جو اموی اور عباسی ملوکیت کے خلاف مسلم عوام کے جذبات کو ٹھنڈا رکھنے کیلئے یہودی اور مسیحی علم کلام سے دلائل لاکر قرآن کی ان سے تطبیق کرنے لگے۔ یہودی علم کلام اور عیسائی علم کلام خود کیا تھا۔ وہ یونانی افکار کی موسوی اور عیسائی مذہب سے تطبیق سے عبارت تھا اور یہی مرض کہنہ اسلام اور مسلمانوں کو لاحق ہوگیا۔ قرآن کی حکمت ودانش کو یہودی اور عیسائی علم کلام کے تتبع

میں یونانی افکار سے تطبیق دے کر مسلم علم کلام کا کاڑ کباڑ اکٹھا ہونے لگا۔ یوں اسلام اپنے عروج کے زمانے میں ہی بغداد کے بیت الحکمت اور دوسرے اداروں کے ذریعے رجعت اختیار کرنے لگا۔ اور مسلمانوں میں قرآنی حکمت ودانش کے برعکس یونانی فکر ودانش اور تہذیب وثقافت کا ایک ترقی یافتہ ماڈل تیار ہو گیا اور جو بقول اقبال اسلامی تہذیب وثقافت سے ہی ارتقایاب ہو کر جدید مغربی ثقافت میں ظاہر ہوا۔ اگر اسلامی تہذیب کو موجودہ یورپی یا مغربی ثقافت میں ہی ارتقایاب ہونا تھا اور یورپی تہذیب کو اسلامی تہذیب کی ہی ترقی یافتہ صورت بننا تھا۔ تو پھر اسلامی تہذیب کی کیا ضرورت تھی۔ کیا محض ایک تاریخی تسلسل کا ہی مرحلہ تھی۔ کیا یہی تمدن جو آج انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے اسلامی تہذیب کا ارتقایافتہ ماحصل ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ یونانی علم ودانش کے اس عربی ایڈیشن سے جس کا نام مسلم علم کلام ہے قرآن کی حکمت کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اس یونانی تہذیب کی ارتقایافتہ صورت ہے جو اسلام کے گملے میں تطبیق کنندگان نے کاشت کی اور جس کی اسلام میں جڑیں کبھی مضبوطی نہ پکڑ سکیں۔ تطبیق کے ساتھ ساتھ موافقتوں کی تلاش کا ایک دھندا شروع ہوا۔ جو تطبیق پذیری سے کم مضحکہ خیز نہ تھا اس میں ہم یونانی، یہودی اور عیسائی علم کلام سے قرآن کی تعلیم اور فکریات کی موافقتیں تلاش کر کے خوش ہوتے ہیں اور تطبیق اور تاویل سے ہم قرآن کی حکمت کو یونانی فکرودانش سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ کام دونوں ہی کے ایک ایسے ہیں دونوں کا مقصد ایک ہی ہے دونوں کند چھریاں ہیں تاکہ وہ قرآن کے احکامات، اعتقادات اور تصورات پر چلا کر انہیں یونانی حکمت ودانش کے سانچوں میں ڈھال کر مسلمانوں کے لئے مرغوب بنا سکیں۔ صد حیف اس پر جبریوں، معتزلیوں اور الکندی، الفارابی، ابن عربی، ابن سینا سے جس تطبیق کے مرض کا آغاز ہوا تھا وہ رکا نہیں۔ عصر جدید میں یہ آلہ سرسید احمد خان نے اٹھالیا۔ اور معتقدات قرآنی اور تصورات قرآنی کی ایسی ایسی تعبیرات اس تطبیق سے سامنے آئیں کہ لوگ چیخ اٹھے۔

ہمارے متقدم علما پر یہ الزام رہا ہے کہ وہ تقلید پر ریجھے ہوئے ہیں اور کورانہ تقلید کی وجہ سے عصر حاضر میں مسلم امہ کو جو مسائل درپیش ہیں وہ ان کا حل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کے دعوے کے مطابق کوئی پانچ سوسالہ سے الہیات اسلامیہ پر جمود کی کیفیت طاری ہے۔ متعدد کئی صدیوں سے عالم اسلام پر ذہنی غفلت اور بے ہوشی چھائی ہوئی ہے اور مسلم ایشیا اور افریقہ کی نئی پود کا مطالبہ ہے کہ ہم اپنے دین کی تعلیمات پھر سے اجاگر کریں اور الہیات اسلامیہ کی نظرثانی بلکہ ممکن ہو تو تشکیل جدید کریں۔ یہ بالکل بجا۔ مگر جس طرح ماضی میں معتزلہ اور ابن سینا، ابن رشد، ابن عربی اور دوسرے مسلم متکلمین نے

اسلامی علم کلام کی تشکیل کرتے ہوئے یونانی افکار سے فلواور فلاطونس کی پیروی میں تطبیق کی اسی طرح اگر عصر جدید میں مغربی طبیعیات کیمیا اور نفسیات کے حاصلات سے تطبیق ہی کرنا ہے اور اسلامی اعتقادات اور تعلیمات کو لچکا موڑا کر ان کے قالب میں ڈھالنا ہے تو اس کام سے کونسا ثواب دارین حاصل ہوگا اور اس سے عصر جدید میں مسلم نوجوانوں کا کونسا مطالبہ پورا ہوگا اور کس طرح ان کا مقدر سنورے گا۔ میں اس کی تفہیم سے قاصر ہوں۔ تطبیق کا سب سے خوف ناک پہلو یہ ہے کہ قدما نے یونانی مفکرین کے افکار کو بغیر کسی نقد و جرح کے درست مان لیا ان کو اصول اولیہ تسلیم کرلیا اور افلاطون، ارسطو، فلو اور فلاطونس کے حاصلات پر ایمان لے آئے کہ وہ نتائج درست ہیں دوسری طرف ایمان کا بھی تقاضا تھا کہ قرآن کی تعلیم بھی درست ہے اب یونانی فکر کی اساس تو عقل اور منطق پر تھی اسے یہ کسی طور جھٹلا نہ پائے تو انہوں نے اپنے ایمان کی مضبوطی کیلئے قرآن کی تاویلات کرکے انہیں ان عقلی حقائق کے مطابق ڈھال کر اسلام کی خدمت فرمادی۔ ہمارا بیشتر اسلامی عقلیات اور علم کلام کا سرمایہ اسی کی نظیر ہے اور اور یہی روش ہم نے سرسید اور اقبال کے توسط سے برصغیر میں بھی رائج کی اب بظاہر قرآن کی جو جو چیز ہمیں عقل، فطرت اور فہم عامہ کے مطابق نظر نہ آئی اس کی توجیہہ، تاویل اور تخریج کردی۔ اس سے جنت ودوزخ مقامات سے احوال میں تبدیل ہوگئے۔ جن کو اجڈ اور وحشی لوگوں پر قیاس کیا گیا وحی کو ابن صیاد کے توہمات اور جدید نفسیات کے نفسی مشاہدات پر قیاس کرتے ہوئے مذہبی مشاہدات سے جواز دینے کی سعی کی گئی اور وحی کی حقانیت کو ولیم جیمز کی نتائجیت سے منسلک کردیا گیا۔ یہی غلطی ابن عربی نے افلاطون کے نظریہ امثال کو اپنا کر کی تھی۔ جن کی تکفیر ابن تیمیہ، آٹھویں صدی کے فقیہہ عبدالرحمن اور خود اقبال نے کی اور اس کی فکر کو زندیقہ اور ضلالت قرار دیا۔ قرآن کی اس قدر مفاہمانہ، معذرت خواہانہ اور مفعولانہ تعبیرات اور تطبیقات پر عقل ودانش کو بھی صرف رونا ہی آتا ہے کہ آخر اس کھکیڑ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم اپنا ناک ہر طرف مروڑتے مروڑتے کہیں ناک ہی نہ گنوا بیٹھیں۔ تاریخ کے اس المیے پر ہمیں آج تو کم از کم سوچ لینا چاہئیے، کہ اس تطبیق سے اسلام اور قرآن کی ہم نے کیا خدمت کی ہے؟

ایک اور فراڈ (Rationalization) کا بھی ہمارے ساتھ کھیلا گیا ہے۔ قرآن جب خود تفکرون، یعقلون، تدبر قرآن کے الفاظ سے غوروفکر کی دعوت دیتا ہے تو اس قرآن کی تعلیمات کی (Rationalization) کے معنی کیا مرتب ہوتے ہیں کہ قرآنی معتقدات اور قرآنی تعلیمات کو عقلیت سے ہم آہنگ کرنا ابھی باقی ہے۔ مجھے تو اس تصور کے بودے پن سے ہی گھن آتی ہے۔ یہ بھی دراصل

تطبیق اور موافقت کی تلاش کا ہی دوسرا نام ہے۔میں ہر اس تصور کو باطل سمجھ کر مسترد کرتاہوں جس میں قرآن ثانوی درجے میں عملی طور پر چلاجائے۔ ہمیں قرآن کا کوئی تصور سمجھ میں نہیں آتا تو یہ کہنے میں کیا برائی ہے کہ ہم ابھی اس کی تفہیم سے قاصر ہیں ممکن ہے کہ آنے والے وقت میں کوئی اور بہتر تفہیم دینے والا ذہن پیدا ہو جائے ہم کیوں کھینچاکھانچی میں پڑنا چاہتے ہیں۔ خود سائنس کے ماضی کے بے شمار تصورات اور قصے مثلاز مین سائنس دانوں کے ہاں پہلے ساکن تھی، کائنات کا مرکز تھی، چپٹی تھی ۔اب یہ تصورات بدل گئے ہیں ۔پہلے مادہ ناقابل فنا، ناقابل تحویل اور قابل دید تھا۔ اب مادہ قابل فنا بھی ہے اور اپنی صورت توانائی کی لہروں میں بھی بدل لیتا ہے اور نظر بھی نہیں آتا۔ پہلے سورج گردش کرتا تھا۔ اب زمین گردش کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سائنس کے تصورات اور نظریات بھی حتمی نہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ نئے علوم کی دریافت سے یہ بھی بدل جاتے ہیں۔ اب (Rationalization) میں ہم سائنس اور علوم کے تصورات کو حتمی اور قطعی اور ناقابل تغیر تصور کر لیتے ہیں اور ان کی اولیت پر ایمان لاکر قرآن کو ان کے مطابق کرکے انہیں عقل کا بپتسمہ دیتے ہیں۔

تیسرا پاکھنڈ حال ہی میں سامنے آیاہے جو شہید اسماعیل راجحی کے نام سے زیادہ شہرت رکھتا ہے اور وہ ہے (Islamization of knowledge) یعنی علوم کو اسلامی کرنا۔ گزشتہ بیس تیس سال سے امریکہ میں انہوں نے یہ سلسلہ شروع کیا اور پاکستان کے علاوہ عالم اسلام کے دیگر ممالک پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ اس کا ایک سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ مغربی علوم کافر ہیں اور انہیں کلمہ پڑھایاجائے اگر آپ بغور اس تصور کو دیکھیں گے تو یہ بھی تطبیق و توافق کی اسلامی علوم سے کوشش سے عبارت ہے۔ اس کے پیچھے یہ شکست خوردگی ہے کہ عالم اسلام تو علوم میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ لہذا مغرب نے جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے اور جو عمرانی علوم حاصل کئے ہیں ان کو اسلام کے مطابق ڈھالاجائے۔ یہ کون کرے گا اور کس طرح ہوگا۔ یہ اپنے تصور سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔

ہمارے عصر جدید کے علمائے علم وفن جن کی تربیت مغربی دانشگاہوں میں ہوئی ہے اور جن کے سینے میں بجاطور پر اسلام کا درد ہے اور وہ اپنی نیت میں بھی مخلص ہیں اور مسلمانوں کی پسماندگی پر جن کادل کڑھتا ہے یہ تین رویے اختیار کیئے ہوئے ہیں۔ جن کا ہمارے ماضی میں بھی تسلسل موجود ہے اور جو ان کے نزدیک حال میں اپنا کر ہم بھی دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر چل سکتے ہیں۔

اس سے پیشتر کہ میں کچھ عرض کروں دو تین باتیں واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ میں کسی بنیاد پرستی، قدامت پسندی یا رجعت پرستی کی طرف مسلمانوں کو نہیں بلارہا۔ اگرچہ میں قرآن کی تعلیمات، اس کے اعتقادات اور قرآن کی وحی پر ایمان کو شرط اول قرار دے رہا ہوں مگر میں

کرسچئین فنڈامنیٹلزم کی طرز پر مسلم فنڈامنٹلزم یا اردو میں معروف اصطلاح بنیاد پرستی کا قائل نہیں ہوں کہ قرآن کی کسی ایسی تاویل اور تعبیر کی وکالت کروں جو کسی خاص فرد یا فرقے کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ میں خود کسی نئے فرقے یا مکتب فکر کی اساس رکھ رہا ہوں اس لئے کہ اسلام میں پہلے ہی فرقے بہت ہیں اور وہ اپنے اپنے نقطہ نظر میں اتنے راسخ ہیں کہ ان کے ہاں کسی اور تعبیر و تاویل کی پذیرائی کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں بلکہ یہ فرقے اصول یا اصل پر اکٹھے ہونے کی بجائے فروعات پر لڑ رہے ہیں۔ اور عالم اسلام اس فرقہ واریت کی بنا پر نہ صرف پسماندہ ہے بلکہ عجیب انتشار اور بربادی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ حالانکہ یہ تمام فرقے اسلام کی اصل تعلیمات واعتقادات پر ایک ہوسکتے ہیں اور فروعی فقہی یا سیاسی اختلاف کو اپنی ذات یا اپنے فرقے تک محدود کرسکتے ہیں۔ اور کسی دوسرے فرقے کو انہیں اپنے فروعی اور ذیلی تصورات اپنانے پر مجبور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر حضرت ابوحنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام ابن حنبل کی فقہی تعبیرات ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود قرآن وسنت اور احادیث کی تعبیرات ہیں تو دوسرے آئمہ کی فروعی تعبیرات کو بھی قرآن وسنت کی محض تعبیرات ہی سمجھنا چاہیے بشرطیکہ وہ مبنی براخلاص اور قرآن وسنت کے اصل الاصول کے منافی نہ ہوں۔ دوسروں کیلئے برداشت اختلاف کا حق اور فروع میں تعبیر کی گنجائش کو قبول کرنا چاہیے تاہم بنیادی اصولوں میں کسی رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ نبی آخرالزمان کے بعد اگر کوئی مدعی نبوت ہے تو بقول اقبال وہ شرک فی النبوت کررہا ہے اور وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

میرا یہ مؤقف بھی نہیں کہ ماضی میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے وہ سارا دریا برد کرنے کے لائق ہے۔ ابوالعلامعری نے مسلمانوں کی پسماندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہمارے ماضی کے طرز پر لکھتے ہوئے کہا تھا کہ امام غزالی اور امام اشعری نے مسلمانوں میں فکر و دانش کا دروازہ بند کر کے تقلید پرستی کو رواج دیا اور اس کے بعد مسلمان غور و فکر کی بجائے تفسیریں و حواشی اور شرحیں لکھنے میں اپنی صلاحتیں غارت کرنے لگے۔ پھر خلاصے لکھے جانے لگے اور پھر خلاصوں کے خلاصے۔ یوں خردافروزی اور ذہنی فکر میں تخلیقی سوچ ماند پڑنے لگی۔ ہمارے علمی زوال کے سبب ترقی رک گئی اور دین میں تقلید پرستی عام ہونے لگی جو سقوط بغداد، سقوط اندلس اور سقوط دہلی پر منتج ہوئی۔ حالانکہ اگر ایسا نہ ہوتا اور مسلمان فکر و دانش کا دروازہ بند نہ کرتے تو جو سائنسی، علمی اور عمرانی علوم میں ترقی ہورہی تھی اس سے مسلم تہذیب زوال آمادہ نہ ہوتی اگرچہ یہ سارا ارتقا یونانی تہذیب کی ہی مسلم دنیا میں نموپذیری کے سوا کچھ نہ تھا تاہم جس طرح طب یونانی طب اسلامی بن کر مسلمانوں میں فروغ پا کر معروف ہوچکی تھی اسی طرح یونانی علم و حکمت مسلمانوں میں

رواج پا کر اسلامی تہذیب کے طور پر معروف ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں البتہ قرآن سے اشتہاد اور استناد بھی کر لیا جاتا تھا۔ بلاشبہ اقبال کے بقول موجودہ یورپی تہذیب اسلامی تہذیب کی توسیع وارتقا ہے مگر اس اسلامی کا جو اپنی اصل میں یونانی تھی اور مسلمانوں میں پروان چڑھی۔ اس نے یونان سے بغداد اور پھر واپس لندن پیرس برلن اور وی آنا کی طرف مراجعت کر لی تو قرآن کی حکمت کے اثرات بھی جزوی طور پر اس پر پڑے مگر اس کا بنیادی طور پر مجموعی مزاج اور منہاج قرآنی نہیں تھا۔ بلکہ یہ یونانی تہذیب کا عربی ایڈیشن تھی۔

یونانی اور یورپی اثرات کے باوجود مسلم دنیا میں امید کی ایک کرن ہمیشہ موجود رہی ہے اور وہ یہ کہ اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود اور انٹ شنٹ تعبیرات کے باوصف تمام علماء، اہل حکمت اور اہل سائنس مسلمانوں نے قرآن سے رابطہ رکھا۔ ہمارے لئے یہ رویہ بڑا حوصلہ افزا ہے۔ بالخصوص قرآن کے مفسرین، محدثین، اہل فقہ، سیرت نگار اور علما کے ایک بڑے طبقے نے قرآن وسنت اور سیرت رسول ﷺ اور اسلام کے دور اول کے فقہی فیصلوں اور آثار کو مرتب کر کے اہم خدمت انجام دی اور وہ بنیادی ماخذات محفوظ کر دیئے جس سے ہم سیرت رسول ﷺ، اسوۂ صحابہؓ اور سنت رسول کی روشنی میں قرآن کے منہاج اور طرز استدلال اور اصول وضوابط مرتب کرنے میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ایسے اصول وضع کر سکتے ہیں جس سے ہم اپنے سے ماقبل یعنی مسلمانوں کے دور نمو، دور عروج اور موجودہ حالات ومسائل اور دنیا بھر کے علوم وفنون کی پرکھ اور جانچ کے سلسلے میں معیارات وضع کر سکتے ہیں۔ باوجود اسکے کہ خود میری اہلیت بھی اس سلسلے میں فرد تر ہے تاہم میں شاید چند بنیادی باتیں تو عرض کر سکوں گا جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ مجھے یہ اصرار نہیں کہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ قطعی، حتمی اور ضروری ہے۔ میں تو اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود صرف ایک نئے طرز احساس کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں کہ شاید امت کی اس ناقہ بے زمام کو سوئے قطار کھینچنے میں کچھ خدمت کر سکوں۔ میرا ایمان ہے کہ ہمیں قرآن کو بلاکسی خوف وخطر کے تمام منطقوں اور استدلالوں سے بالاتر ہو کر اولین کسوٹی مان لینا چاہیے۔ زبانی نہیں۔ عقلی اور عملی طور پر۔ ہر اس تصور اور نظریے کو رد کر دینا چاہیے جو قرآن کے ایک شوشے کے بھی خلاف ہو۔ اب دوسرے نظریات سے قرآن کی تعلیمات کی تطبیق کی بجائے قرآن کے اصولوں کی پرکھ پر علم، فلسفہ، سائنس اور عمرانی علوم کے حاصلات کی پرکھ اور رد وقبول ہونا چاہیے۔ اس کیلئے قرآن کا بھی از سر نو مطالعہ کرنا ہوگا۔ قرآن سے عمرانی، اخلاقی، سیاسی اور سائنسی نظریات کا انضباط کرنا ہوگا۔ اور ان کی روشنی میں جدید حاصلات کے معیار کا تعین کرنا ہوگا۔ اس کیلئے ہم قرآن کی مرضی خود قرآن سنت

رسول ﷺ اور سیرت رسول ﷺ اور اسوہ صحابہؓ سے معلوم کریں گے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ ہمیں حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی طرف ہر معاملے میں رجوع کرنا ہے کیونکہ ان کی سنت، ان کی سیرت اور ان کے کردار کے برعکس جوراستے ہیں وہ سوائے بوالہبی کے اور کہیں نہیں لے جاتے۔ قرآن کے بعد آنحضرت ﷺ کی سنت اور ان کی سیرت ہی سب کیلئے حجت ہے۔ آپ ﷺ کی محبت آپ ﷺ کے اتباع کا نام ہے۔ حضور ﷺ کے ادنیٰ فرمان کے سامنے تمام استدلالات اور منطقیں صفر ہیں۔ ہمیں ہر معاملہ میں خلوص نیت سے یہ دیکھنا ہے کہ نبی پاک ﷺ آج کی صورت حال میں درپیش مسئلے کے بارے میں کیا رویہ اختیار فرماتے۔ اور اس کے حل کیلئے کیا رہنمائی فرماتے۔

تیسرا اصول اسوہ صحابہؓ کا ہے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا تھا کہ صحابہ نجوم ہدایت ہیں۔ ہمیں انفرادی اور معاشرتی تمام معاملات میں اور طرز جہاں بانی میں ان کی راہ عمل، طرز استدلال اور طریق زندگی سے رہنمائی حاصل کرنا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ اور دوسرے صحابہ اور صحابیات کے طریق زندگی سے اپنے لئے زندگی کرنے کے اصول وضع کرنے ہیں اور اس سلسلے میں ہمارے اکابر محدثین، آئمہ فقہ اور علمانے جو اصول مرتب فرمائے ہیں ان ہی کی روشنی میں اتباع اور پیروی میں عصری تقاضوں کے لئے اجتہادات کرنے ہیں۔ اصول دین میں ہمیں ان کا اتباع کرنا ہے اور فروعات میں بھی، ان سے رہنمائی لینا ہے۔ پھر وہ معاملات جن میں اجتہاد میں دقت ہو اس کے لئے ایک واضح اصول معاذ بن جبل نے وضع فرمادیا کہ ہمیں قرآن وسنت اور اجماع صحابہ سے روشنی میں درپیش اس مسئلے کا یہی حل قیاس سے دینا ہے جو ہمیں قرآن وسنت میں بظاہر نظر نہیں آتا۔ تفقہ فی الدین رکھنے والوں کیلئے قرآن وسنت کا مسائل میں منشا معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔

قرآن نے انسانیت کے جملہ مسائل کو دو بنیادی تصورات میں حل کردیا ہے۔ ایک تو اصول توحید ہے اور دوسرا توحید انسانیت ہے۔ یعنی خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔ اس اصول نے تمام ادیان اور تمام نظریات کو مشخص کردیا ہے اور یہ بات واضح کردی ہے کہ خدا کے نزدیک دین صرف اسلام ہے جو حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی دین ہے۔ یہ تمام حضرات خدا کے پیغمبر اور رسول تھے اور ان پر خدا کی طرف سے ہی الہامی کتب اور صحیفے نازل ہوئے اور یہی دین اسلام حضرت محمد ﷺ پر آکر مکمل ہوا۔ یہ پرانی الہامی کتب حضرت محمد ﷺ کی تصدیق کرتی ہیں اور قرآن ان کی

تصدیق کرتا ہے۔ خدا نے ایک ہی آدم تخلیق کیا اور اس کو ایک ہی دین دے کر بھیجا۔ یہ تمام ادیان خدا کی توحید کی تعلیم دیتے ہیں تاہم علم کی کمی، ذرائع ابلاغ کی عدم دستیابی اور بعد کے تعصبات اور حالات نے اس دین اسلام کو شخصیات سے نسبت دے دی اور توحید میں شرک کی آمیزش کر کے خدا کی ذات کے ساتھ ان پیغمبروں کو بھی شریک کرلیا جس کی تعلیم انہوں نے نہیں دی تھی۔ مغرب کی یہودیت اور عیسائیت کے مذہبی مراکز بھی ایشیا میں واقع ہیں اور ان کا قبلہ اول بھی ایشیا میں واقع ہے ان کی الہامی کتب بھی ایشیا میں ہی نازل ہوئی یعنی مشرق ہی اہل مغرب کا روحانی مرجع ہے لہذا ان کے پاس مشرق سے تصادم اور مخاصمت کی کوئی وجہ نہیں بقول ابوریحان البیرونی سقراط اور افلاطون بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار تھے۔ سقراط کی توحید پرستی اور اخلاقی کمال سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ جب اہل یہود کا اور عیسائیوں کا خدا ایک ہے وحی اور الہامی کتب، قبلہ اور یوم آخرت پر ان کا ایمان ہے اور وہ نماز یعنی خدا کی عبادت بھی کرتے ہیں تو اس بات سے ان کے روحانی رشتوں کی توثیق ہوتی ہے۔ یہودی توحید پرست ہیں عیسائیوں کا وہ فرقہ جو برناباس انجیل پر ایمان رکھتا ہے توحید پرست ہے اور تثلیث ماننے والے بھی اصل خدا کو بھی خدا مانتے ہیں تو تینوں اقوام یا تینوں مذاہب میں خدا، وحی، رسولوں، الہامی کتب، یوم آخرت اور جزا و سزا اور حیات بعد الموت کے عقائد پر اتفاق ہے۔ یعنی فروعی اختلافات کے باوجود مشرق اور مغرب میں مذہب کے انفراسٹیکچر پر کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔ تو مشرق اور مغرب دونوں کو سوچنا چاہیے کہ آخر انہوں نے کس بنیاد پر ایک دوسرے کو زیر کرنے کے عذاب میں خود کو مبتلا کر رکھا ہے۔

قرآن اور خود توریت اور انجیل بھی اولین انسان حضرت آدم کو تسلیم کرتے ہیں اور روئے زمین پر جتنے بھی انسان ہیں وہ حضرت آدم اور حضرت بی بی حوا کی اولاد ہیں۔ یعنی نوع انسانی خواہ وہ سری لنکا میں آباد ہو یا کنیڈا میں، سب اولاد آدم ہے۔ نوع انسانی ایک خاندان اور ایک کنبہ ہے تو کیوں نہ تمام اولاد آدم ایک خاندان کی طرح اتفاق، محبت اور پیار سے زندگی بسر کرے۔ اب جب کہ سائنس نے یہ فاصلے سمیٹ دئیے ہیں، ملنا جلنا آسان ہو گیا ہے۔ ایک دوسرے سے مکالمہ کرنا اور دکھ درد بانٹنا بالکل ہی سہل ہو گیا ہے۔ دنیا کے ایک کونے کے آدمی دوسرے کونے کے آدمی سے بات کرسکتا ہے اس کو دیکھ سکتا ہے اور ضرورت پر اس کی مدد کو پہنچ سکتا ہے۔ رنگ و نسل اور زبان کے امتیازات اس کیلئے بے معنی ہیں کہ یہ توموسمی اثرات کا نتیجہ ہے، نسل بھی اصل میں آدم کی نسل ہے۔ چھوٹی موٹی ذاتیں، گروہ بندیاں محض ایک دوسرے کی پہچان کیلئے ہیں۔ آنے والی صدیوں میں جس تیزی سے مختلف قوموں اور

نسلوں کا اختلاط ہو رہا ہے یہ امتیازات بھی بے معنی ہو کر رہ جائیں گے اور صرف انسان باقی رہ جائے گا جو اپنی ایک ہی نسل رکھتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے اور بس۔

مغرب کے بعض دانشوروں جس میں کومت اور ژاں پال سارتر بھی شامل ہےمنے کہا تھا کہ فرد سماج کا دشمن ہےفرد سماج کے اصولوں کو اپنے لئے زنجیریں تصور کرتا ہے اور سماج فرد کی آزادی کو کچل دیتا ہے اور اس پر پابندیاں عائد کرتا ہے۔ یہ بھی ایک نکتہ نظر ہے جو مغربی عمرانیات کے دانشوروں نے ایجاد کیا اور ایک نکتہ نظر یہ بھی ہے کہ فرد سماج میں آنکھ کھولتا ہے سماج فرد کی پرورش کرتا ہے اس کی ذات کو تشخص عطا کرتا ہے اور اس کی صلاحیتوں کی پرورش اور پرداخت کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح فرد اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر سماج کو ترقی، تعمیر اور فلاح کی منزل عطا کرتا ہے فرد کے بغیر سماج کا کوئی تصور نہیں اس لئے کہ فرد اس کی بنیادی اکائی ہے اور سماج فرد کیلئے رحمت ہے کہ وہ اس کی زندگی کی ضمانت اور اس کی صلاحیتوں کیلئے جولان گاہ ہے فرد اور سماج دونوں ایک دوسرے کے دوست اور ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔

آج کی بے پناہ سائنسی ترقی سے مشرق اور مغرب میں ویسے بھی فاصلے ختم ہوگئے ہیں۔ حد بندیاں ٹوٹ گئی ہیں یا ٹوٹ جائیں گی ایسے میں ایک کرہ ارض ایک گھر ہوگا اور اس کا باسی انسان۔ آہستہ آہستہ پرانے یہ تمام تصورات دم توڑ دیں گے جو ایک ہلاکت خیز تعصب نے مشرق مشرق اور مغرب مغرب ہے کے نام پر پال رکھے ہیں اور بے مقصد محض جہالت کی بنیاد پر مذاہب، تہذیبوں اور اقوام کا تصادم بنا رکھا ہے۔

آج سب سے اہم انسان ہے کرہ ارض کا انسان، خدا کا نائب، خدا کا خلیفہ، اس زمین کا باسی انسان، بے پناہ مسائل اور مصائب میں گھرا ہوا انسان، بے پناہ وسائل پر حاوی ہونے کے باوجود بھوک جہالت، تعصبات، بیماریوں اور آفات زمین اور ستاروں میں گرفتار انسان، ستاورں کی گزر گاہوں کی تلاش میں کامیابی کے باوجود اپنے افکار کی دنیا میں قدم دھرنے سے خوف زدہ ہے جو ابھی تک زندگی کی شب تاریک کو سحر نہیں کرسکا۔ جب انسان ایک ہے تو اس کی تہذیب بھی ایک ہے اور اس کی ثقافت بھی ایک ہے اور اس کا خدا اور دین بھی ایک ہے۔ لہذا آج کا سب سے بڑا مکالمہ خود انسان ہے سب سے بڑا موضوع یہی ہے۔ مغرب کے نئے دانشوروں کو اکیسویں صدی میں مشرق اور مغرب کے مفروضہ مصنوعی اور خود ساختہ تصادمات کی ڈفلی بجانے کی بجائے آج کے انسان کے تحفظ کی بات کرنی چاہیے۔ اس کیلئے خوراک، لباس، رہائش اور تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے اسے عدل، انصاف اور امن کی فضامہیا

کرنی چاہئیے یہ کتنی بد قسمتی کی بات ہے کہ وہ اس ہولناک ایٹمی اسلحہ کے ڈھیر پر بیٹھا تھر تھر کانپ رہا ہے جو خود اس نے بنا رکھا ہے یا بنا رہا ہے۔ قوموں اور تہذیبوں کے حصار توڑ کر سب کو خدا کی بادشاہتوں میں داخل ہونا چاہیے جہاں امن اور سلامتی ہے۔ جہاں نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی ڈر بلکہ سب کے لئے امان ہی امان ہے۔ تصادم میں ہلاکت ہے اور باہم مل بیٹھنے میں زندگی ہے۔

آج کے انسانوں کے درمیان یہی مکالمہ ہونا چاہیے کہ وہ کس طرح دنیا میں ایک مبنی برانصاف، معاشی استحصال سے پاک اور اصول عدل اور مساوات پر ایک عالمی سماج تخلیق کرسکتے ہیں جہاں ایک دوسرے کے وسائل لوٹنے کی بجائے خدا کے دیئے ہوئے رزق کو سب انسانوں میں تقسیم کرنے کا نظام وضع کیا جاسکے۔ ایٹم اور ٹیکنالوجی کو انسانیت کا آلہ قتل کی بجائے خادم بنادیا جائے۔ جو زمین کے خزانے نکالنے میں معاون ہو جس سے اناج پیدا ہو، بھوک مٹ سکے اور تمام انسانوں کو تن ڈھانپنے کو کپڑا اور رہنے کو گھر مل سکے اور ہر شخص کو کتاب مل سکے۔ خدا نے انسان پر رزق کے دروازے بند نہیں کئے کیونکہ وہ لاکھوں بچوں کو اس لئے پیدا کررہا ہے کہ ابھی اس کے پاس کھلانے کو سب کچھ موجود ہے۔ دنیا بھر کے مدبروں اور دانشوروں کو اپنی سوچ کے زاویئے اب یوں ترتیب دینے چاہیں کہ وہ انسانوں کیلئے رزق، کپڑا ،مکان، عدل، انصاف اور علاج، تعلیم کے وسائل فراہم کرنے کی تدابیر پیش کریں اور اس کیلئے انسان ہونا ہی کافی ہو، کالا، گورا، ایشیائی، افریقی، یورپی، امریکی، مسلم، عیسائی ہندو یا یہودی کا امتیاز نہ ہو۔ ہم انسانوں میں اختلاف رائے سننے، اسے برداشت کرنے اور اپنے اصولوں پر خود عمل کرنے اور دوسروں پر تھوپنے سے باز رہنے کا سلیقہ سکھیں۔ نوع انسانی کے گلدستے میں یہ رنگ و نسل، عقیدہ و زبان، لباس اور نشست و برخاست کا رنگا رنگ تنوع اسی طرح دل فریب ہے جس طرح گل دان میں مختلف رنگوں کے پھول بہار دیتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر خوبصورت لگتے ہیں لوگوں میں جب سچائی کو سننے اور اختلاف کو قبول کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا تو وہ خود ایک ایسی سچائی کو قبول کرلیں گے جو آدم سے لے کر آج تک ایک ہی ہے اور وہ توحید خدا اور توحید نسل انسانی ہے۔

ممکن ہے یہ میری ان معروضات کو اہل مغرب قبول کرنے میں ذرا سا ہچکچائیں کیونکہ انہیں اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدمستی میں میری آواز ایک ترقی پذیر ملک کے ایک فرد کی آواز محسوس ہوگی جو انہیں امن و سلامتی کے نام پر مسلمانوں کے لئے کسی رعایتی رویے کیلئے پکار رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات خود مغرب کے بھی مفاد میں ہے کہ وہ تصادم کو کچلنے کی اور دوسروں پر برتری اور تسلط کی راہ چھوڑ کر انسان کی فکر کریں۔ میری درخواست کا اصل ہدف خود مسلمان ہیں کہ وہ میری معروضات پر غور کریں

اور اس کے لئے اپنا لائحہ عمل مرتب کریں جس کے تحت اولین سطح پر مندرجہ ذیل اقدامات کریں۔

۱۔ سب سے پہلے وہ قرآن وسنت سے رجوع کریں اور ایسے اقدمات کریں کہ ان کے ہاں قانون اور آئین کا بنیادی منبع قرآن وسنت ہو۔ ان کے ہاں سیاسی، معاشی، عدالتی اور سماجی نظام قرآن وسنت کی روشنی میں تشکیل پائیں۔ اس وقت پاکستان، افغانستان، ایران، ترکی، الجزائر اور سوڈان وسط ایشیائی مسلم ریاستوں میں جو اسلامی تحریکات چل رہی ہیں انہیں مستحکم کریں اور ان کا دائرہ دوسری مسلمان ریاستوں پر بھی پھیلا کر پوری مسلم دنیا کو قرآن وسنت کی حکمرانی کا گہوارہ بنادیا جائے تاکہ اسلام کا نفوذ ہو۔ اور اسلام کا نفاذ عمل میں آسکے۔ مسلمان خود بھی اپنی زندگیاں اسلام کے مطابق ڈھالیں کیونکہ محض ریاست میں اسلام کے نفاذ سے اسلامی معاشرہ تشکیل نہیں دیا جاسکتا۔

۲۔ مسلم ممالک پہلی سطح پر اپنی اپنی شناخت رکھتے ہوئے اپنے ہاں جمہوری خلافتیں قائم کریں اور یہ خلافتیں آپس میں ربط کے راستے تلاش کریں۔ یہ جمہوری خلافتیں اپنے اپنے خطوں میں خود مختار ہوں تاہم یہ آپس میں دفاعی معاہدات کرسکتی ہیں۔ تجارت میں پہلی ترجیح ایک دوسرے کو دیں، تعلیمی وظائف دیں اور آپس میں آمدورفت کی پابندیاں ختم نہیں تو نرم ضرور کردیں تاکہ مسلم عوام کا آپس میں میل جول بڑھے، تجارت کے ساتھ ساتھ مشترکہ صنعت کاری، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ میں تعاون کرسکتی ہیں، یہ تمام ممالک اپنے اثاثے اور سرمائے کو اسلامی بینک میں رکھیں اور امریکہ اور یورپ کے بنکوں سے اپنے اثاثے اور سرمائے کو یہاں منتقل کریں تاکہ ان کا سرمایہ ترقی اور صنعت کاری میں ان کے کام آئے۔

۳۔ تمام مسلم ممالک میں عربی لازمی قرار دے دی جائے۔ یورپی زبانوں کو اختیاری قرار دیا جائے تمام اسلامی ممالک میں نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کا ایک ہی انفراسٹرکچر ہو صرف مقامی ضروریات کے تحت اس میں حشووزائد ہو عالم اسلام میں ایک بڑا علمی ادارہ ہو جس کی ہر اسلامی ملک میں شاخ ہو یہ ادارہ ہر کتاب کو خواہ وہ سائنسی علوم کی ہو یا عمرانی یا ادبی اس کو غیر مسلم ایشیائی اور یورپی زبان سے اسلامی ممالک کی زبانوں میں منتقل کرے جن میں عربی، فارسی اردو، ترکی، بنگلہ دیشی اور انڈونیشی زبانوں کے علاوہ علاقائی زبانیں بھی شامل ہیں تاکہ عام مسلمانوں کو غیر ملکی زبانوں کی محتاجی سے نجات مل سکے۔

۴۔ عالم اسلام کو ذرائع ابلاغ، ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبارات، رسائل اور خبر رساں ایجنسیوں کا ایک اپنا میڈیا سسٹم تشکیل دینا چاہیے تاکہ وہ خبروں اور اطلاعات پر اپنا کنٹرول قائم کرسکیں اور ان کا دوسروں پر انحصار ختم ہو۔ اس مسئلے میں انہیں اپنی پالیسیاں خود وضع کرنی چاہیں اس طرح مواصلات کا اور رسل